eISSN: 2073-3674
pISSN: 1991-7813

CC BY
OPEN ACCESS

وبائی سیاق، کرونائی صورتِ حال اور اُردو افسانے کی تخلیقی صورت گری

Epidemic context, covid situation and creative shaping of Urdu fiction

محمد الیاس کبیر اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو، گورنمنٹ ولایت حسین اسلامیہ گریجویٹ کالج، ملتان

Muhammad Ilyas Kabir, Assistant Professor, Dept. of Urdu, Government Wilayat Hussain Islamic Graduate College, Multan

ڈاکٹر سائرہ ارشاد لیکچرار، شعبۂ اُردو، گورنمنٹ صادق کالج ویمن یونی ورسٹی، بہاول پور

Dr. Saira Irshad, Lecturer, Department of Urdu, Government Sadiq College Women University, Bahawalpur

Abstract

In post-colonial societies, when epidemics arise, along with these epidemics, the multinational corporations emerging from the corporate sector begin to emerge with all their exploitative torments, while on the one hand, the possibilities, implications and fears of the epidemic begin to emerge. At the same time, such multinational institutions appear in our society. In this context, while literature has found a new direction, Urdu fiction could not remain unmindful, keeping in view the context in which we have been able to declare them as saviors from this epidemic. The themes of Urdu fiction open new doors of thought besides connecting with society.

Key words: Lock down, Exploitation, epidemic, Urdu, Short story, Memories

کلیدی الفاظ: لاک ڈاؤن، استحصال، وبا، اردو، افسانہ، یادیں

جب بھی کوئی اہم موضوع مباحث کا حصہ بنتا ہے تو اس کے لیے ایک وسیع تناظر ہمارے پیش نظر ہوتا ہے تاکہ اس تناظر کو سمجھنے، اس پر بات کرنے اور اس کی مختلف جہات کو دیکھنے کے لیے اس کے دائرہ کار کا احاطہ کیا جا سکے۔ بالخصوص ایسا موضوع جو عالمی نوعیت کا حامل ہو اس کے لیے تحدید کرنا کارِ مشکل ہے۔ جب بات عالمی سطح کی ہو تو ایک وسیع تناظر کو ہی دیکھا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر چشمِ فلک ے مختلف وبائیں (خصوصاً عالمی وبائیں) دیکھیں، ان کی تباہ کاریاں اور مابعد وباصورتِ حال کا جائزہ لیا جائے تو اندزہ لگانا مشکل نہیں کہ ان وباؤں نے ہمیشہ ایک جگ جہان کو بری طرح متاثر کیا۔ دنیا (بالخصوص تیسری دنیا) میں ان وباؤں کے مختلف النوع اثرات مرتسم ہوئے: بیماری، بے روزگاری، موت، مہنگائی، عالمی سطوح پر انقطاع، کارپوریٹ کلچر کی پورے تزک واحتشام سے ترویج وارتقا وغیرہ کی بدولت ان وباؤں نے کسی حد تک تنہائی اور اجنبیت کو بھی جنم دیا۔

اگر ہم عالمی وباؤں کی تاریخ پر ایک نظر ڈالیں تو ہمارے سامنے دن مختلف نوعیت کی ہولناک ترین وبائیں نظر آتی ہیں مثال کے طور پر۔:

۳۲۰۰سال قبل مشرقِ وسطیٰ میں ایک وبا نے تباہی مچائی اور اس خطے کی تمام معروف ریاستوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا، جن میں بابل (موجودہ دور میں جنوبی عراق)، اشور (موجودہ دور میں شمالی عراق)، مصر، ھاتی (موجودہ دور میں مشرقی ترکی) اور قبرص سمیت کئی علاقے شامل تھے۔ یہ ریاستیں یا تو کرہ ارض سے مٹ گئیں یا پھر ایک ایسے تاریک دور سے گزریں جو کئی صدیوں تک ان پر سیاہی کی چادر تانے رہا۔ اس تباہی کو آج ہم، "برونز ایج کولیپس"، یعنی تانبے کے دور کے خاتمے کی اصطلاح سے یاد کرتے ہیں اور اس تباہی کے پیچھے جنگ، قحط، سیلاب اور دیگر فطری وجوہات کے علاوہ ایک اہم وجہ، عالمی وبا تھی۔ اس وقت تک اس خطے کے افراد زیادہ تر تجارت کے ذریعے ایک دوسرے سے منسلک تھے اور شاید اسی وجہ سے یہ وبا بے انتہائی تیزی کے ساتھ پھیلی اور مصر سے لے کر ھاتوسا اور پھر بال تک کئی ہزار افراد اس وبا کے ہاتھوں اپنی زندگیاں گنوا بیٹھے۔:

> "ایسی بیماری سے بہت بڑے پیمانے پر یہ خطرہ لاحق ہو رہا ہے کہ لاکھوں انسانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا کر افسانہ نہ بنا ڈالے۔ ہم ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتے ہیں کہ اس مرگِ انبوہ سے پہلے یہ بیماری خود افسانہ بن کر رہ

جائے۔ کاش، یہ کہانی ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اپنے انجام کو پہنچ جائے۔" [۱]

آج کی طرح اس عالمی وبا نے بھی مذہب، نسل، ذات اور قومیت کی تفریق کیے بغیر لوگوں کو اپنے عتاب کا نشانہ بنایا۔ اس دور میں قبرص اور بابل اور مصر بھیجے گئے خطوط اور دستاویزات سے اُس تباہی کا نشان ملتا ہے جس نے بادشاہ و سپاہی، خاص و عام، فرعون یا غلام، کسی کو بھی نہیں بخشا۔:

"بابل کی قدیم سلطنت 'اکاد' کی زبان' اکادو' میں اس وبا کو 'کسارو متانو' کا نام دیا گیا یعنی 'باندھ دینے والی بیماری' اسی طرح جس شخص اور وہ علاقہ جہاں یہ بیماری پھیل جائے اسے 'لپٹم' کا نام دیا گیا یعنی وہ جسے خدا کے قہر نے چھو لیا ہو۔" [۲]

۱۵۶ء تا ۱۸۰ عیسوی تک جاری رہنے والی وبا جسے "انتونین" کا نام دیا گیا۔ اس وبا نے اس وقت یورپ کے بڑے حصے کو تہہ وبالا کیا جب رومی سلطنت پورے عروج پر تھی۔ اس وبا میں پچاس لاکھ سے ایک کروڑ تک نفوس لقمۂ اجل بنے۔ اس وبا کو خسرہ اور چیچک کا نام بھی دیا گیا۔ ۵۴۱ء تا ۵۴۲ء میں آنے والی وبا "جسٹینن" نے اڑھائی کروڑ افراد شکار کیے۔ اس وبا نے صرف دو سال کے عرصے میں بازنطینی اور اس سے ملحقہ ساسانی سلطنتوں کو سیلاب کی طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ۱۳۴۷ء سے ۱۳۵۱ء تک "سیاہ موت" کے نام سے ایک وبا منظر عام پر آئی جس میں ساڑھے سات کروڑ تا ۲۰ کروڑ ہلاکتیں ہوئیں۔:

"جراثیم نے سب کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے اور کوارنٹین تو انہیں دوزخ کی مانند لگنے لگی اور شاید یہی وجہ تھی کہ لوگ بیماری کو چھپا رہے تھے آثار نظر آنے پر بھی علاج سے پرہیز کر رہے تھے، کوارنٹین کا خطرہ جو تھا! جب کسی گھر سے میت نکلتی تب پتہ چلتا کہ یہ کنبہ وبا کی زد میں ہے۔" [۳]

انسانی تاریخ کبھی اتنے بڑے سانحے سے دوچار نہیں ہوئی۔ طاعون کی اس وبا نے دنیا کو اس قدر متاثر کیا کہ کہا جاتا ہے کہ اگر یہ وبا نہ آئی ہوتی تو آج دنیا کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔ ماہرین کے مطابق طاعون کا جرثومہ مشرقی ایشیا سے ہوتا ہوا تجارتی راستوں کے ذریعے مشرقِ

وسطیٰ اور پھر یورپ جا پہنچا جہاں وہ ۳۰ سے ۶۰ فیصد آبادی کو موت کے منہ میں لے گیا۔ تباہی اس قدر بھیانک تھی کہ پورے شہر میں مُردوں کو دفنانے والا کوئی نہیں بچا۔ ۱۹۱۵ء تا ۱۹۲۶ء میں آنے والی ایک شدید ترین "نیند کی وبا" منظر عام پر آئی۔ اس وبا کا باعث ایک جرثومہ تھا جو دماغ کے اندر جا کر حملہ کرتا تھا۔ اس بیماری کو گردن توڑ بخار کی ایک شکل سمجھا جا سکتا ہے جس کی بدولت مریض پر شدید غنودگی طاری ہو جاتی ہے۔ مرض کی شدت میں مریض ہل جل نہیں سکتا اور بت کا بت بنا رہ جاتا ہے۔ اس وبا نے پندرہ لاکھ کے قریب افراد کی زندگی کا چراغ گل کیا۔ ۱۹۱۸ء تا ۱۹۲۰ء "ہسپانوی فلو" کے نام سے ایک وبا دنیا کے نقشے پر اُس وقت ظاہر ہوئی جب دنیا جنگِ عظیم اوّل کی وجہ سے خاک و خون میں غلطاں تھی۔ اس وبا نے دس کروڑ کے قریب لوگوں کو اپنا شکار بنایا۔ ویسے تو طاعون کی بیماری وقتاً فوقتاً سر اٹھاتی رہی ہے، لیکن ۱۷۷۲ء میں ایران میں ایک ہیبت ناک وبا پھوٹ پڑی۔ اس زمانے میں اس موذی مرض کا کوئی علاج نہیں تھا جس کی وجہ سے اس نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔:

> "۱۹۵۷ء تا ۱۹۵۸ء میں چین ہی سے ایک فلو اٹھا جسے 'ایشیائی فلو' کا نام ملا۔ اس نے دیکھتے ہی دیکھتے دنیا بھر کو لپیٹ میں لے لیا۔ بعض ماہرین کے مطابق یہ وائرس بطخوں سے انسانوں میں منتقل ہوا تھا۔ اس وبا سے بیس لاکھ کے قریب لوگ مارے گئے، جن میں صرف امریکہ میں ۷۰ ہزار ہلاکتیں شامل ہیں۔"[۴]

فی زمانہ دیگر وباؤں کی Covid-19 کا نام دیا گیا ہے۔

> "یہ وائرس اس لئے خطرناک ہے کہ یہ انسان سے انسان کے درمیان پھیلنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔۔" [۵]

ن سبت کرونا وبا جسے یہ قدرے مختلف نوعیت کی وبا ہے کہ اس میں کم اموات واقع ہوئی ہیں، اس کی مختلف وجوہات ہو سکتی ہیں۔ تیز ترین میڈیا بالخصوص سوشل میڈیا کی تیز رفتاری کے سبب سماجی شعور کی سطح بلند ہو گئی ہے، بیماری کی بروقت تشخیص اور سستا علاج، حکومتوں کی طرف سے سخت ترین اقدامات اور دیگر بہت سے پہلوؤں سے دیکھا جائے تو یہ موجودہ وبا کم نقصان دہ ثابت ہوئی ہے۔ لیکن اس کے اثرات معاشی سطح پر بہت بھیانک ثابت ہوئے ہیں۔ پوری دنیا کا اقتصاد متاثر ہونے کی بنا پر بے شمار لوگ بے روزگاری کا شکار ہوئے۔ کسی بھی وبا کے اثرات صرف معاشی طور پر ہی نہیں بلکہ سماجی، سیاسی اور ادبی طور پر بھی اس

کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ موجودہ وبا نے اردو ادب کے شہ دماغ ہم سے چھین لیے: آصف فرخی، شمس الرحمن فاروقی، علامہ طالب جوہری، اختر نقوی، سلطان جمیل نسیم، مسعود مفتی، اطہر شاہ خان جیدی، قاضی جاوید، قیصر محمود طارق چغتائی اور دیگر کئی شہ دماغ ہم سے چھین لیے وغیرہ لیکن ان وباؤں نے دنیا کو بڑا تخلیقی ادب بھی دیا ہے۔

گیبریل گارشیامارکیز کا ناول لاطینی امریکا کے "Love in The Time of Cholera"

البرٹ کامیو،("The Plague")

ڈینیل ڈیفو("A Journal of the Plague Year")

اورمارگریٹ ایڈونStation Eleven(، ایملی سینٹ جان منڈیلThe year of) (flood مارگریٹ ایڈون

کیتھرین این پورٹر(Pale Horse, Pale Rider) اس کی چند ایک عمدہ مثالیں ہیں۔

اردو دنیا میں بھی اس حوالے لکھا گیا، حسن منظر کا ناول "وبا" اور مستنصر حسین تارڑ کا ناول "کوچہ خالی، خانہ خالی" کے عنوان سے منظر عام پر آیا۔ خاور چودھری کا افسانوی مجموعہ "طلسم کہن" کرونائی پس منظر میں اردو ادب کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے جس میں کرونا کے حوالے سے مختلف طرح کی صورتحال اور سماجی زندگی پر اس کے اثرات کا بھرپور اظہار شامل ہے۔ سادہ اور عام فہم اسلوب کی حامل کہانیوں میں روزمرہ کے جیتے جاگتے کرداروں اور ان کی نفسیاتی کیفیت کو عمدہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ان افسانوں میں جہاں خوف کی فضا قائم ہے وہیں امید کی کرنیں بھی جگمگاتی نظر آتی ہیں۔

نورالہدی کا علامتی افسانہ "المیہ" انسانی تاریخ کے تین ادوار میں منقسم ہے۔ افسانے میں زمین اور اس کی مخلوقات کے ساتھ روا رکھے گئے انسانی سلوک کے معیارات کا حوالہ شامل ہے۔:

> "مٹھی بھر مخلوق اشرف ہے ورنہ اکثریت کم تر ہے۔ جو اشرف ہے، اس کی مٹھی میں سب کی جان ہے اور اسے دراصل کمزور کا خوف ہی سب سے اشرف بناتا ہے۔"[٦]

محمد حمید شاہد کا افسانہ "کورونا اور قرنطینہ" بظاہر ذاتی تجربے کا عکاس ہے تاہم اس میں اجتماعی انسان کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس افسانے میں سوشل میڈیا کے ذریعے پھیلائی گئی افواہوں اور خوف و ہراس کو موضوع بنایا گیا ہے۔ افسانے کا متکلم ایک واٹس ایپ ویڈیو میں کرونا سے وفات پا جانے والے شخص کی لاش دیکھ کر خوف محسوس کرتا ہے اور خود کو ٹھنڈ کی بدولت چھینک کے بعد کرونا کا مریض سمجھ لیتا ہے۔ اس کے گھر والے بھی دوری اختیار کرتے ہیں جب کہ وہ خود بھی خوف میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

ناصر عباس نیّر کا افسانہ "مرگ عام نعمت ہے" سب سے پہلے "دنیازاد" کے "وبا نمبر" میں شائع ہوا بعد میں ان کے افسانوی مجموعہ "ایک زمانہ ختم ہوا" میں شامل ہوا۔ اس افسانے میں اشرافیہ کی نفسیات شامل ہے۔ وبا کس طرح معاشرتی قدروں کو تبدیل کرتی ہے نیز فرد کی ذات اور نفسیات پر اپنے گہرے اثرات مرتب کرتی ہے ۔ اس کا بھرپور اظہار افسانے میں شامل ہے۔:

> "آدمی کی انا جس قدر احسان فراموش ہے ،اس سے زیادہ کینہ پرور ہے۔ ہم اس اصول کی مدد سے اپنی قوم کے انسانوں کی روح کی نئی تعمیر کریں گے۔"[۷]

افسانہ "ادھوری تصویر" ایک ایسے جیتے جاگتے کردار سے متعلق ہے جو رشتوں میں گم ہو جانے کے باوجود تنہائی کا شکار رہا اور کرونا کی بدولت یہ تنہائی موت کے مدمقابل جا ٹھہری اور وہ ماضی کی گم گشتہ یادوں میں اس محبت کو کھوجنے لگا کہ جس کا مکمل عکس بنانے کی کوشش کے باوجود کینوس پر ادھورا نقش رہا اور پھر قرنطینہ کے دنوں میں اسے محسوس ہوا کہ بے شمار محبتوں میں گھرے رہنے کے باوجود اس کی نامکمل محبت اپنا مکمل وجود رکھتی ہے ۔بقول راجندر سنگھ بیدی:۔

> "کوارنٹین کوئی بیماری نہیں، بلکہ وہ اس وسیع رقبہ کا نام ہے جس میں متعدی وبا کے ایام میں بیمار لوگوں کو تندرست انسانوں سے ازروئے قانون علیحدہ کر کے لاڈالتے ہیں تا کہ بیماری بڑھنے نہ پائے۔"[۸]

"بہار نو میں خزاں رفتہ" انسانیت کے تقاضے نبھانے والوں کی بے چینی اور سماجی فاصلے کی بدولت کئی سوالوں کا متقاضی ہے۔ عہد حاضر میں اپنے پیاروں کا درد تو محسوس ہو جب

کہ اوروں کا احساس محض ویڈیو بنا کر کیا جائے، نامناسب ہے۔ زمانے کی ترقی کے باوجود انسان اسی غار میں رہتا ہے کہ جہاں اسے محض اپنی ضروریات کی فکر تھی۔

خاور چودھری کے افسانوں میں روزمرہ زندگی کے معمولات اور انداز فکر پایا جاتا ہے۔ وہ اپنے گردوپیش کی معمولی صورتحال سے غیر معمولی نتائج سامنے لاتے ہیں۔ بظاہر سادہ اوتہہ دار پہلو بھی ہیں۔ گھروں میں موجود افراد کس طرح وبائی صورتحال سے نمٹ رہے تھے نیز ان کی زندگی میں کیا کچھ تبدیلیاں آئیں، یہ کیفیت ان افسانوں شدت سے محسوس ہوتی ہے ۔ابتدا میں فراغت سے گزرا وقت بھلا معلوم ہوتا ہے تاہم وقت کے ساتھ ساتھ یہ تفریح وبال جان محسوس ہوتی ہے۔:

> "جن مردوں کے پاس عورتوں کی ضروری باتیں سننے کا وقت نہیں تھا اب پورے پورے دن ان کو عورتوں کے طعنے سننے پڑ رہے ہیں، یہ لاک ڈاؤن ان کی زندگی میں تو وبال بن گیا ہے۔"[۹]

حکومتی اقدامات کے باوجود بڑے پیمانے پر اس وائرس پر قابو پانہایت مشکل مرحلہ ہے۔ قیاس آرائیوں کے باوجود یہ حقیقت بھی اپنی جگہ موجود رہتی ہے کہ۔:

> "وبا پر قابو پانا محض حکومت کا کام نہیں پوری قوم جب تک ایک مٹھی ہو کر آگے نہیں پڑے گی یہ مصیبت نہیں جائے گی مسلکی اور مذہبی منافرت نہیں کا موقع نہیں وائرس زائرین کی وجہ سے نہیں پھیلا بلکہ تبلیغی جماعت کے اراکین بھی اس کا ایک بڑا سبب ہے یہ عرض کی چلتی پھرتی فیکٹریاں ہیں۔ "[۱۰]

ایسے افراد جو حد درجہ احتیاط کے باوجود اس وبا سے محفوظ نہ رہ سکے ان کے لئے موت تک سفر کس قدر اذیت ناک ہوتا ہے یہ حقیقی تصویر کشی افسانہ "کونپل کا قتل "میں محسوس کی جا سکتی ہے۔ خاور چودھری کی حالاتِ حاضرہ پر کڑی نظر ہے یہی وجہ ہے کہ وہ نا صرف روزمرہ زندگی کے واقعات کو کہانی کا روپ دیتے ہیں بلکہ مختلف مکتبۂ فکر کی زندگیوں پر اس واقعے کے اثرات سے متعلق صورتحال کو نہایت خوبی سے بیان کرتے ہیں۔ ڈاکٹر حضرات اس وائرس کا براہِ راست شکار ہیں تاہم ان کی زندگیاں دوسروں کی جان بچانے کی کوشش میں

موت کی بھینٹ چڑھ رہی ہیں۔ اسی طرح سماجی خدمات انجام دینے والے بھی یہ سوچ رکھتے تھے کہ۔:

"یہ معاملہ اللہ کے ساتھ ہیں میں ہوں نہ ہوں یہ مت سوچنا بہر حال انسانیت کے دکھوں کا مداوا کرنا جو سہولیات میسر ہیں انہیں دردمندوں تک پہنچانا۔"[۱۱]

یوں وبا کے حوالے سے پورا مجموعہ مختلف طبقوں کے خدشات، مشکلات اور نفسیات کا عکاس ہے کہیں بھوک کو مرکزی اہمیت ملی اور کہیں خدمت خلق کا درس شامل ہے، اسی طرح کاروباری زندگی کے معطل ہو جانے کی بدولت لوگوں کی بے چینی کا احوال بھی کہانیوں کا موضوع بنتا ہے۔ عالمی وبا اور اس کی بدولت درپیش خدشات نے عہد حاضر میں انسانوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ "طلسم کہن" میں اس سارے عمل کی وضاحت کچھ اس طرح کی گئی۔:

"ڈھیل کو طاقت خیال کرنے سے ہی تو انسان دھوکہ کھاتا ہے وہ جو موت کو شکست دینے کا جتن کر رہے تھے ؛وہ جو مدیر کو نظر انداز کر کے مدار کو اپنی مرضی کے تابع کرنا چاہتے تھے ؛اس ایک وائرس سے ہراساں ہو چکے ہیں ۔پوری دنیا حزن آشنا اور ناقابلِ یقین صورتِ حال کا شکار ہے ۔کوئی ہو گا جو طمانیت سے مستقبل کی طرف دیکھتا ہو گا ورنہ اکثریت ایک ان دیکھے خوف میں مبتلا ہے۔لوگ اپنے ہم جنسوں سے ملاقات اور تعلق استوار کرتے ہوئے وحشت زدہ ہو رہے ہیں۔"[۱۲]

جب وبا کے دنوں میں محبت کی کونپلیں پھوٹنے لگیں اور اس میں مبتلا افراد ایک دوسرے کو بغیر کسی احتیاطی تدابیر کے اپنے لمس سے محبت کا احساس کشید کریں تو قربت ودوری کی دونوں صورتیں موت کا احساس دلاتی ہیں۔:

"جس چیز کو انسان دبا کر رکھتا ہے وہ موقع پاتے ہی غیر متوقع ظاہر ہو جاتی ہے۔"[۱۳]

دعا عظیمی کا افسانہ "محبت نامے لکھنے والی لڑکی" میں دریائے ڈان کی رہائشی بلیو بیل کرونائی صورتحال سے معاشی طور پر متاثر ہوتی ہے کیونکہ۔:

"وبا کا پھیلنا کسی شہر کے جنگ کی لپیٹ میں آ جانے جیسا ہوتا ہے۔"[۱۴]

تاہم بلیو بیل ان دنوں محبت میں بھی مبتلا ہو جاتی ہے اور یہ جاننے کے باوجود خود کو نہیں روک پاتی کہ اسے جس شخص کی محبت نے اپنے وجود کا احساس دلایا، وہ اس نئے مرض کا شکار ہو چکا ہے لہذا اس کی طرف سے محبت نامہ اور کرنسی کے نوٹ بلیو بیل کو سرشاری میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ یہ صورتحال جہاں خوف کا باعث ہے وہیں محبت پا لینے کی حسرت کا بھی خوبصورت اظہار ہے۔:

"سچ تو یہ ہے کہ یہ آپ کے نام ہے، اجنبی کی آواز ساری دنیا پہ حاوی ہوتی جا رہی تھی۔ دنیا ایک بیماری کے تاپ میں مبتلا تھی مگر جنگل میں رقص طاؤس جاری تھا۔"[۱۵]

کرونائی صورتحال کی بدولت جہاں عام افراد کے لیے زندگی کی چہل پہل نے دم توڑ دیا وہیں ڈاکٹر حضرات بھی اس وائرس سے براہ راست مقابلہ کر رہے ہیں ۔ عظیم اللہ ہاشمی کا افسانہ "شب غم کا چاند" ایک میڈیکل آفیسر ڈاکٹر شہریار کی زندگی کے معاملات پر بات کی گئی ہے جو اس آفت سے سے بچاؤ کے لیے مریضوں کی دن رات خدمت کرتا ہے تاہم اس کی اپنی نجی زندگی اس سارے عمل میں متاثر ہوتی ہے۔ وہ ہسپتال کے ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے اپنے گھر سے دوری اختیار کر لیتا ہے تاکہ اپنے پیاروں کو محفوظ رکھ سکے۔ ڈاکٹر شہریار وائرس سے مر جانے والوں کا نوحہ بیان کرتا ہے جو قاری کو اذیت میں مبتلا کرتا ہے۔:

"عالم انسان پر اتنی بڑی افتاد اِس سے پہلے کبھی نہیں آئی۔ اِس مرض میں مرنے والوں کی لاش ہم لوگ وارثین کو نہیں دے رہے ہیں بلکہ سرکاری خرچ سے اجتماعی تدفین ہو رہی ہے کیونکہ لاعلاج وبائی مرض بری طرح پھیل گئی ہے۔ مرنے والوں کی تعداد دن بہ دن تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ ایک ایک دن میں دو دو ڈھائی ڈھائی ہزار آدمی مر رہے ہیں اِس لیے جراثیم کو مزید پھیلنے سے روکنے کے لیے اجتماعی قبریں دی جا رہی ہیں تاکہ مشترکہ طور پر زیادہ سے زیادہ جراثیم کو مٹی میں دبایا جا سکے یا لاش پلاسٹک کے بیگ میں اچھی طرح پیک کر کے سمندری جہاز کی چھت پر رکھ دی جاتی ہے اور جب بیچ سمندر میں جہاز پہنچتا ہے اُس

وقت کپتان کے اشارے پر ایک کارندہ سلاخ کی مدد سے لاش سمندر
برُد کر دیتا ہے۔" [۱۶]

صائمہ نفیس کا افسانہ محنت کش طبقے کے مسائل پر مبنی کہانی میں وہ "لاک ڈاؤن" کی صورتحال کے پیشِ نظر لوگوں کو احتیاطی تدابیر کے حوالے سے چوکنا کرتی ہیں۔ روزی کمانے کے لیے کی گئی کوششوں میں رکاوٹ کس طرح عام افراد کو متاثر کرتی ہے۔ ریاض کی دکان بند تھی اور وہ سو طرح کی فکروں میں گھرا ہوا تھا تاہم اس نے حکومت کی اجازت ملنے پر ایک بار پھر اپنے کام کا آغاز کر دیا۔ اس کی بیٹی جب کہتی ہے۔:

"ہاں بابا میں روز آپ کے لئے دُعا مانگتی ہوں میری دُعا قبول ہوئی جبھی تو آپ کو کام ملا سب کے ابو آج کل گھر پر ہیں مگر آپ دکان جاتے ہیں اور سلائی کرتے ہیں۔ اللہ میاں آپ کے کام میں بہت بہت برکت دے۔ [۱۷]"

بیٹی کے منہ پر ہاتھ رکھ کر دعا ادھوری کرنا دراصل لاشعوری کیفیت ہے، انسانی زندگی کو خطرے سے دوچار کرنا بھی خوف کی علامت بن جاتا ہے اور کم و بیش یہی صورت حال اس دعا کے مکمل نہ ہونے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ سراج فاروقی کے ہاں بھی غریب طبقے کے مسائل اور زندگی کی دیگر مشکلات سے نبرد آزما ہونے والے افراد کی کہانیاں ملتی ہیں، اس سارے عمل میں اگر کسی کی موت واقع ہو جائے تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ کرونا کی بدولت زندگی سے محروم ہو گیا تاہم حقیقت اس کے برعکس ہے۔:

"غریب کو بھوک سے بڑھ کر کیا بیماری ہوتی ہے؟ اس کی بھوک مٹ جائے، سب بیماری اپنے آپ ختم ہو جاتی ہے۔" [۱۸]

مختلف افسانوں میں جہاں مایوسی اور زندگی کی بے ثباتی کو بیان کیا گیا ہے وہیں۔ "امید نو" ایسی کہانی ہے جو حالات کی سنگینی کے باوجود پر عزم رہنے کی تلقین کرتی ہے۔ افسانے میں ایک فیکٹری کے مالک کی صورتحال بیان کی گئی ہے جو اپنی بیٹی کی شادی کے انتظامات میں مگن تھے تاہم کرونا کی بدولت شادی ملتوی ہو گئی، وہ وہاں میں ان کا اکلوتا بیٹا تعلیم کی غرض سے مقیم تھا تاہم حالات بہتری کی طرف گامزن ہوئے اور لاک ڈاون میں انہیں احساس ہوا کہ زندگی کے وہ لمحات انمول ہوتے ہیں جو اپنوں کے سنگ گزریں۔:

"اپنوں کے ساتھ وقت گزارنا اور مشکل میں گھرے انسانوں میں آسانیاں بانٹ کر وہ ایسی حقیقی خوشی اور دلی سکون سے روشناس ہوئے جو کبھی کروڑوں منافع بھی نہیں دے سکا تھا۔ وطن عزیز میں پھیلی کرونا کی موزی وبانے جہاں انھیں پیاروں کے قریب کیا، دوسروں کا ہمدرد و غمگسار بنایا تھا، وہیں انھیں زندگی جینے کی نئی امید و امنگ سے بھی روشناس کرادیا تھا۔"[۱۹]

محبت صرف اپنے گھر کی تکمیل اور اپنے پیاروں کا احساس کرنے تک محدود نہیں ہوتی بلکہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں غفلت سے کام نہ لینا بھی اس کا ایک روپ ہے۔

"رابعہ الربا افسانہ" اکلوتی اولاد ملک و قوم کے لیے نقصان دہ ہے میں دلچسپ انداز بیان سے ایسے کرداروں کو منظر عام پر لاتی ہیں کہ جو بچپن میں اکلوتا ہونے کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اور بعد میں اپنی انا اور ضد جیسی خاصیتوں کے ساتھ حکمرانی سنبھال لیتے ہیں جس کی بدولت ان کے فیصلے ملک و قوم کے لئے نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں۔:

"ٹرمپ نے جب سے یہ خواب دیکھا ہے اسے کرونا کا مرض لاحق ہو گیا ہے۔

مودی خوف میں ہے کہ سردی آرہی ہے کہیں اس کو بھی یہ مرض گلے نہ لگالے۔

بورس جانسن تنہائی میں گاتا پکڑا گیا ہے۔

ساتھ جئیں گے، ساتھ مریں گے۔

ایلف شفق ان متاثرہ "باشاہوں" پہ نیا ناول لکھنے کا سوچ رہی ہے۔
کیونکہ رومی بھی بس ایک "بادشاہ یا مولوی" ہی تھا۔" [۲۰]

سراج فاروقی افسانہ "بدمعاش" میں ایسے تاجروں کی عیاری سے واقفیت دلاتے ہیں کہ جو مشکل حالات میں مہنگی چیزیں بیچ کر منافع کمانے کے چکروں میں رہتے ہیں۔ ایسے ہی ایک تاجر ملکی صورتحال کو پس پشت ڈال کر یہ مشورہ دیتا ہے۔:

"فائدہ کماؤ... مہنگا لے جاؤ....اور مہنگا بیچو، اس سے بڑھیا موقع بار بار ہاتھ نہیں آئے گا۔"[۲۱]

افسوس کا مقام ہے کہ ہم مذہب سے دوری اختیار کرتے ہوئے خوف خدا کی بجائے کمانے کے چکروں میں پڑے رہتے ہیں۔

افسانہ "اناج پانی" ایسے نیک دل شخص کی کہانی بیان کرتا ہے کہ جو لاک ڈاؤن کے دنوں میں غریبوں کی مدد کرتا ہے۔اس مقصد کی بلا تفریق تکمیل ہی انسانیت کی معراج ہے، کہانی کا مرکزی کردار یہ بات واضح طور پر کہتا ہے۔:

"یہ ہندو مسلم کا مسئلہ نہیں ہے سر، انسانیت کا معاملہ ہے۔" [۲۲]

اگر انسانیت کی بات ہو تو اس وبا کی بدولت جہاں لوگوں نے موت کے خوف میں مبتلا ہو کے غریبوں کی مدد کی تا کہ انہیں اس مصیبت سے نجات مل جائے وہیں اکثر لوگ اس انتظار میں رہے کہ یہ وبا اس طرح جاری و ساری رہے تا کہ ان کی مدد ہو، ایس اہی ایک گھرانہ کرونا کی بدولت اچھے حالات میں زندگی گزار رہا تھا اور انھوں نے برملا اظہار کیا۔:

"یہ کرونا کب تک رہے گا؟ یہ کتنا اچھا ہے۔۔۔ ہم بھائی بہنوں کو کتنا آرام مل رہا ہے۔۔۔ ہمارا باپ اب کھانے کو لاتا ہے۔۔۔ ہماری دعا ہے یہ کرونا اب کبھی نہ جائے۔۔۔ اس نے ہمارے باپ کو بھی گھر کے لیے کچھ لانا سمجھایا ہے۔۔۔ اے کرونا! تیرا شکریہ۔" [۲۳]

افسانہ "بیٹیاں اچھی ہوتی ہیں" ایک چھوٹے سے واقعے کا عکاس ہے تاہم اس میں یہ احساس دلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ جب بیٹے والدین کے کام نہ آ سکیں تو ایسے موقعے پر بیٹیاں ہی ان کا سہارا بنتی ہیں۔ بوڑھے والدین لاک ڈاؤن کے دنوں میں اپنی جمع پونجی بینک سے نکلوانا چاہتے ہیں تا کہ گھریلو اخراجات میں مشکل پیش نہ آئے، اس موقع پر ان کا بیٹا پیسے بٹورنا چاہتا ہے تاہم والدین اس کی اصلیت سے واقف تھے اس لئے اپنی بیٹی پر بھروسہ کرتے ہیں جو اپنے والد کو بینک تک لے جاتی ہے۔:

"ماں اندر سے چلاتے ہوئے۔۔۔۔ نہیں۔۔ نہیں۔۔۔۔ آپ اس کمبخت کو اپنی بینک کی کتاب نہیں دینا۔۔۔ اس کا کیا ہے یہ تو سب کھا پی کر اڑ دے گا

---ویسے ہی اس کرونا اور لاک ڈاؤن نے ہماری کمر توڑ دی ہے اب اس نالائق کو بینک کا راستہ اور دکھا رہے ہو۔"[۲۴]

کہانی جاندار نہیں ہے کیونکہ محض بیٹے کی نیت کا اظہار کر دینا یہ واضح نہیں کرتا کہ واقعی ان کا بیٹا بینک کی رقم خود خرچ کرنا چاہتا تھا۔ کرونائی صورتحال سے جہاں خوف اور موت کا سایہ منڈلانے لگا وہی تنہائی کا شکار افراد اپنی بے بسی کا ماتم کرتے رہے۔ نورالحسنین کا افسانہ "زندہ در گور" ایسے ماحول کا عکاس ہے کہ جس میں بھرے گھر کے مکین اسپتال میں لاوارثوں کی طرح اپنے دن گن رہے ہیں اور اس موقع پر اگر کسی کا کرونا ٹیسٹ پازیٹو آجائے تو بیک وقت اس کی زندگی کی رونقیں ختم ہو جاتی ہیں۔:

"ایک عجیب سی تنہائی تھی جیسے وہ زندہ در گور ہو گئے ہوں، نہ کوئی پُرسانِ حال تھا۔ نہ کوئی انسانی آواز سنائی دیتی تھی۔" [۲۵]

افسانے کا مرکزی کردار بھی اسی کیفیت سے دوچار ہے۔ منیر احمد اپنے گھر والوں سے الگ تھلگ ہسپتال میں اس خوف سے زندگی گزر رہا تھا کہ اب اس کے پاس گنتی کے چند دن ہیں، دوسرے مریضوں کو دیکھ کر اسے زندگی کی بے ثباتی کا یقین ہو چلا تھا۔ اب اسے اپنے قرب وجوار کہ وہ کردار بھی شدت سے یاد آئے تھے جن سے اس نے ہمیشہ بیزاری اختیار کی۔

افسانہ "خوش خبری" میں لالچ کو کو موضوع بنایا گیا ہے۔ گھر کا بزرگ وبا سے نمٹنے کی جدوجہد میں مصروف تھا، لالچی خاندان کے لئے یہ خبر کسی صدمے سے کم نہیں تھی کہ وہ کرونا کو شکست دے چکے ہیں تاہم بٹوارہ کرنے والوں کی چال قاری کو ایک لخت چونکا دیتی ہے۔:

"کیا؟ سب کے ہوش اُڑ گئے. افراتفری مچ گئی اور کچھ دیر بعد مون اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

جائیداد کے تین حصے ہوئے ہیں نا۔ اب اسے چار حصوں میں بانٹا جائے۔

یہ چوتھا حصہ دار کون آگیا بھیا؟

چوتھا حصہ دار ڈاکٹر مہرہ ہیں۔" [۲۶]

افسانہ "گڈ بائی" میں ایک تنہا بڑھیا کے کرب کی داستان ہے۔ وہ اپنے بچوں سے ملنے کو ترستی تھی، کرونا نے کبھی کبھار کی ملاقات کی آس بھی ختم کر دی، اب اسے تنہائی کا خوف تھا ۔روح پرواز کرنے سے قبل اسے زندگی یہ احساس دلاتی ہے انسان کی موقع پر اس قدر بے بس ہو جاتا ہے ہے کہ جیتے جی اسے اپنوں کی جدائی اداس کر دیتی ہیں اور مرنے کے بعد یہ بھرم بھی ختم ہو جاتا ہے کہ اپنوں کا کندھا نصیب ہو گا۔:

> "اُس نے دِل ہی دِل میں اپنے ربّ کو مخاطب کرتے ہوئے دعا کی کہ اُسے اِس وبا میں مرنے والوں کی طرح بے گور و کفن موت نا نصیب کی جائے۔۔۔ مگر اُس دعا کی قبولیت سے پہلے ہی اُسے اپنا وجود آسمان کی طرف پرواز کرتا محسوس ہونے لگا۔"[۲۷]

"راندۂ درگاہ" دیار غیر میں مقیم ایسے افراد پردیس میں رہتے ہوئے اپنی واپسی کا تصوف بھول جاتے ہیں تاہم وہ اس صورتحال کی بدولت انہیں نہ صرف اپنا آپ ادھورا محسوس ہوتا ہے بلکہ موت کے خوف اور زندگی کی یک لخت رک جانے کی بدولت ایسے افراد جب وطن واپس آتے ہیں تو انہیں سب کچھ اجنبی محسوس ہونے کے بعد بھی کم از کم یہ تسلی ضرور محسوس ہوئی کہ وہ اپنا کوئی نہ کوئی ایسا ٹھکانہ ضرور رکھتے ہیں کہ سستا سکیں۔ انتظار کی سولی پر لٹکنے والے طنز میں ڈوبے لہجے کے باوجود خیال رکھنا نہیں بھولتے۔:

> "کچھ نہیں ہو گا احمد حسن! میں نے قرنطینہ کے اٹھارہ برس کاٹ لیے۔ بس تم ٹھیک ہو جاؤ۔ میں امید کی دنیا میں جیتی ہوں۔ جس چھت تلے تم موجود ہو اس میں امان ہی امان ہے۔ میں نے اس گھر کو، جہاں تم مجھے چھوڑ گئے تھے کسی درگاہ کی طرح رکھا۔ امید اور آس کے چراغ جلا کر۔ اس گھر سے بلائیں اور وبائیں سب دور رہیں گی۔" [۲۸]

کرونائی صورتحال نے جہاں لوگوں کو اپنے گھروں میں قید پر مجبور کر دیا ہے وہیں اس وقت حیرت راہ تکتی ہے کہ جب قید خانے میں مجرم رہائی سے ڈر جاتے ہیں کیونکہ انہیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ قید کے بعد کم از کم وہ بآسانی آزادی حاصل کر سکیں گے اور اگر انھیں رہا کیا جا رہا ہے تو دوسرے لفظوں میں یہ قدم سرعام پھانسی دینے کے مترادف ہے۔ اسی لیے افسانہ "آزادی نہیں چاہیے" میں مجرم واضح طور پر یہ کہتے ہیں۔:

"آپ ہمیں آزادی نہیں دلا رہے ہیں. بلکہ باہر کورونا وائرس کے شکنجے
میں دیکر ہمیں سزائے موت دینا چاہ رہے ہیں۔" [۲۹]

واقعاتی یا ہنگامی حالات میں تخلیق کردہ ادب کی اپنی اہمیت ہوتی ہے لیکن بعض اوقات یہ خوف بھی محسوس ہوتا ہے کہ کہیں اس طرح ادب میں سطحی پن تو پیدا نہیں ہو رہا ہمارے سامنے ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ کسی بھی دور کا جائزہ لیں، یہ صورتحال متوازی چلی آ رہی ہے، بالخصوص آج کے دور میں جب دنیا کارپوریٹ کلچر میں تبدیل ہو گئی ہے، ایسی وبا اسر اٹھائے کہ جس نے سماج کی تمام چیزوں کو یک لخت تبدیل کر دیا، ادب لکھنے والوں میں بعض نے سنجیدگی سے لکھا تاہم اکثر ادباء کے ہاں ہنگامی صورتحال کو اہمیت حاصل رہی۔ جنگ عظیم اول اور دوم میں بھی ایسا منظر دیکھنے کو ملا ۱۹۴۷ء کی تقسیم ہو یا ۶۵ء اور ۷۱ء کی جنگوں پر نظر دوڑائیں تو لکھا بہت گیا تاہم بڑے ادب کی تخلیق کم ادیبوں کا مقدر بنی۔ فیض آج بھی زندہ ہیں جبکہ جالب کو وہ مقام نہیں مل سکا کیونکہ نظریئے اور نعرے کا فرق ہے۔

کرونائی صورتحال پر مبنی ان افسانوں کا جائزہ لینے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ ادیب جہاں اپنے حساس ہونے کا ثبوت فراہم کرتے ہیں وہیں زندگی کے مختلف معاملات پر بھی ان کی گہری نظر اور تصور کارفرما ہے۔ معاشرتی مسائل، لوگوں کی نجی زندگی کو درپیش مشکلات اور لاک ڈاؤن جیسی صورتحال سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ معاشی طور پر لوگ پریشانی میں مبتلا ہیں نیز نفسیاتی الجھنوں اور موت کا خوف بھی ان کے سروں پر منڈلا رہا ہے۔ کرونا بظاہر ایک جرثومہ ہے تاہم اس کے اثرات نے جہاں پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا وہیں یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ اردو افسانے نگاری کو اس وبا نے نیا رخ دیا۔ اب لوگ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہیں ۔ مختلف طرح کے حالات جہاں امید کا دامن تھامنے پر مجبور کرتے ہیں وہیں بسا اوقات یہ محسوس ہوتا ہے کہ جب قدرت خود اپنا فیصلہ صادر کر دے تو انسان کی منصوبہ بندی ناکام ثابت ہوتی ہے۔

حوالہ جات

1. https://www.humsub.com.pk/305242/asif-farrukhi-132

۲۔ مورخہ ۲۵مئی ۲۰۲۰ www.bbc.com/urdu/world

۳۔ ۲۲اپریل ۲۰۲۰ http://avadhnama.com

4-https://daleel.pk/2020/02/02/128248

۵۔ ۹فروری ۲۰۲۰ www.independenturdu.com

۶۔ نورالہدی شاہ،"المیہ"مشمولہ:دنیازاد،شمارہ۴۹،کراچی:اکتوبر ۲۰۲۰ء،ص۴۷

۷۔ ناصر عباس نیر،"ایک زمانہ ختم ہوا ہے،لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۲۰ء، ص۱۱۶

8-https://m.thewireurdu.com/article/quarantine-disease-rajindar-singh-bedi-story/83668

۹۔ urdu.culturebooklet.com ۲دسمبر ۲۰۲۰

۱۰۔ خاور چودھری،'طلسم کہن'،فیصل آباد:مثال پبلشرز،۲۰۲۰ء،ص:۳۷۔

۱۱۔ ایضا،ص:۹۰

۱۲۔ ایضا،ص:۱۰۲

13. https://urdu.culturebooklet.com/Blog/bismilazad

۱۴۔ 305242/.pk+https://www.humsub.com امارچ ۲۰۲۰

۱۵۔ www.independenturdu.com ۹فروری ۲۰۲۰

۱۶۔ urdu.culturebooklet.com ۲۱اکتوبر ۲۰۲۰

۱۷۔ urdu.culturebooklet.co ۲۲اکتوبر ۲۰۲۰

۱۸۔ urdu.culturebooklet.com ۱۶ اکتوبر ۲۰۲۰ء

۱۹۔ urdu.culturebooklet.com ۱۴اکتوبر ۲۰۲۰ء

۲۰۔ Urdu.culturebooklet.com ۱۰ اکتوبر ۲۰۲۰

۲۱۔ urdu.culturebooklet.com ۱۷ اکتوبر ۲۰۲۰ء

۲۲۔ urdu.culturebooklet.com ۱۳ اکتوبر ۲۰۲۰

۲۳۔ https://urdu.pamirtimes.net ۲۸مارچ ۲۰۲۰،

۲۴۔ urdu.culturebooklet.com ۳۰ اکتوبر ۲۰۲۰ء

۲۵۔ urdu.culturebooklet.com ۲۱ اکتوبر ۲۰۲۰،

۲۶۔ urdu.culturebooklet.com ۱۸ اکتوبر ۲۰۲۰،

۲۷۔ urdu.culturebooklet.com ۲۱ اکتوبر ۲۰۲۰،

۲۸۔ urdu.culturebooklet.com ۱۵ اکتوبر ۲۰۲۰،

۲۹۔ urdu.culturebooklet.com ۱۴ اکتوبر ۲۰۲۰،